شخصیت اور یادوں کے نقوش:

استاذنا حضرت

مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

تحریر:

مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی

مہتمم وشیخ الحدیث

جامعہ عربیہ امدادیہ مراد آباد

مندرجات

استاذ نا حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

اس دور قحط الرجال میں بالعموم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ علمی مسندیں مسند نشین اہل علم و تحقیق کے لئے عظمت و وقار اور وجاہت و مقبولیت کا باعث ہوتی ہیں، ایسا خال خال اور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ مسند نشین شخصیت علم و فضل کے حوالے سے اتنی باوزن اور باعظمت ہو کہ وہ بجائے خود مسندِ علمی کے وقار کو چار چاند لگا دے اور اس کے دم سے اس مسند کا وقار و اعتبار قائم و باقی رہ جائے ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

استاذ نا حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ انہیں نابغۂ روزگار اور عظیم شخصیات میں تھے، بلکہ بے جا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ متنوع کمالات کی جامعیت، علمی رسوخ اور عملی صلاح، انہماک اور انضباط اوقات، بے مثال اور منفرد انداز تفہیم وطرز تدریس اور حق گوئی کی جرأت وقوت کے حوالے سے ان کی ذات گرامی موجودہ علمی افق پر ’’بدر مبین اور ماہِ کامل‘‘ کا مقام رکھتی تھی ۔

وَلَيْــسَ عَـلَـى الـلّٰـهِ بِمُسْتَنْكِرٍ
أَنْ يَـجْـمَـعَ الْـعَـالَـمَ فِـيْ وَاحِـدِ

حضرت کے امتیازات وخصوصیات کا ذکر ایک مختصر مضمون میں کیا ہی نہیں جا سکتا، اس کے لئے مبسوط کتاب درکار ہے، ان سطور کے حقیر راقم نے ان کی شخصیت میں جو سب سے بنیادی اور نمایاں کمالات و امتیازات دیکھے اور محسوس کئے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہی قارئین کی نذر ہیں۔

(۱) علمی جلال و وقار

اللہ رب العزت نے حضرت کو متانت، وقار اور وجاہت کا ایسا پیکر مجسم بنایا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے پر آپ کے علمی جلال اور عظمت کی ہیبت اور رعب ضرور طاری ہوتا تھا، اوصاف نبوت میں یہ مذکور ہے:

مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهُ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اچانک ملتا تھا اس پر آپ کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور جو شناسائی کے ساتھ ملتا جلتا تھا وہ آپ کا گرویدہ بن جاتا تھا۔

ان اوصاف کی تجسیم حضرت مفتی صاحب کی ذات میں خوب خوب نظر آتی تھی، اول وہلہ میں ہر ملنے اور آنے والا مرعوب ہو ہی جاتا تھا، مگر بار بار کی ملاقاتوں اور رفاقت اور مصاحبت کے بعد کیفیت یہ ہوتی تھی کہ حضرت اپنی سادگی، بے تکلفی، خوردنوازی اور وسعتِ ظرف سے اپنی محبت کا اسیر اور اپنا گرویدہ بنا دیتے تھے، اس کا تجربہ ان کے تلامذہ اور خوردوں کو بار بار ہوتا تھا، اور ہر مرتبہ دل ان کی عقیدت سے لبریز اور دماغ ان کی عظمت و رفعت کے آگے خمیدہ ہو جاتے تھے۔

ان سطور کے حقیر راقم کو بھی ربع صدی تک حضرت سے وابستگی کی سعادت میسر رہی، اس دورانیے میں پہلا سال (دورۂ حدیث کا سال) باضابطہ تلمذ اور باقی اوقات مسلسل (براہِ راست بھی، ٹیلی فونک رابطے کے ذریعہ بھی اور حضرت کی بلند پایہ تالیفات کے واسطے سے بھی) استفادہ و استفاضہ کا شرف حاصل رہا، حضر میں بار بار اور سفر میں گاہے گاہے ملاقات، زیارت، خدمت میں حاضری اور مقالات، مضامین، کتب اور تراجم پر نظر ثانی اور اصلاح کے عنوان سے دیر دیر تک علمی مجالست کے علاوہ متعدد بار طویل اسفار میں کئی کئی دنوں تک خادمانہ رفاقت کا زریں موقعہ دستیاب ہوا، اور ہر بار حضرت کی شفقت و عنایت، سادہ مزاجی، بے تکلفی، اپنائیت، مربیانہ و ناصحانہ اصلاح، علمی نکتہ آفرینی، ہمت افزائی اور ترغیب و تشویق جیسی خصوصیات کا خوب خوب تجربہ ہوتا رہا۔

جلال و جمال یا یوں کہئے کہ وقار و متانت اور بے تکلفی و اپنائیت کا یہ خوب صورت امتزاج (جو بہ ظاہر دھوپ اور چھاؤں کا سہانا منظر رکھتا ہے) حضرت کی حیات و سیرت کا بے انتہا امتیازی گوشہ ہے، اور اسی کا نتیجہ ہوتا تھا کہ ان کے تلامذہ، مستفیدین، اور زائرین کے دل بیک وقت ان کی عظمت اور محبت دونوں سے آباد و سرشار رہا کرتے تھے، کسی شخصیت میں محبوبیت اور عظمت دونوں کا اجتماع خاص انعام الٰہی ہوتا ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۲) تشجیع اور خردنوازی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ بڑے اور باعظمت ہوتے ہیں، اپنی ذات کے حصار میں بند ہو جاتے ہیں، پھر ان کی مصروفیت اور مزاج کی ساخت دونوں انہیں دوسروں سے فاصلے کا عادی بنا دیتے ہیں، مگر حضرت مفتی صاحبؒ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، ان کا حال تو "باہمہ اور بے ہمہ" دونوں کا جامع اور انداز ع "شمع محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق" ہوتا تھا۔

ان کی بے پناہ مصروفیات ایک طرف کہ دم لینے کی بھی فرصت نہ تھی، مگر خردوں کے ساتھ تشجیع، ہمت وحوصلہ افزائی، اصلاح وتشویق اور ترغیب وتحریض کا سلسلہ بھی جاری رہا کرتا تھا، اور یہ کبھی کبھار کا نہیں روزمرہ کا معمول تھا، چھوٹوں کو آگے بڑھانا، انہیں آگے جانے کے ہنر بتانا، انگلی پکڑ کے انہیں راہ سجھا دینا، بے تکلف اپنے تجربات سے آگاہ کر دینا اور ان کی نقائص سے لبریز کاوشوں کی تحسین کر کے ان کا دل بڑھا دینا اور حوصلہ جما دینا حضرت کی ادائے دل نواز اور خوئے نادر مثال تھی۔

اس حوالے سے اس حقیر کو اپنے ذاتی متعدد تجربات لوح دماغ پر تازہ نظر آ رہے ہیں، اس حقیر کو دورۂ حدیث کے سال میں حضرت سے جامع ترمذی اول اور شرح معانی الآثار پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، ترمذی میں امتحان سالانہ میں حضرت کے قلم سے مجھے پورے ۵۰ نمبر حاصل ہوئے، اس سال دورۂ حدیث کی جماعت میں ترمذی میں اتنے نمبر حاصل کرنے والا اتفاق سے تنہا میں ہی تھا، آئندہ شوال میں جب حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی تو حضرت نے ہر ہر کتاب کے نمبرات دریافت کئے، میں نے ترمذی کا نمبر ذکر کیا تو حضرت چونکے اور فرمایا: وہ تمہاری کاپی تھی؟ پھر کچھ توقف کے بعد بولے: تم نے جوابات بہت سلیقے سے لکھے ہیں، ترتیب بھی اچھی ہے، عربی بھی اچھی ہے، تحریر بھی مناسب ہے جسے اور بہتر بنانا چاہئے، ماشاء اللہ: تمہاری کاپی نمایاں تھی، اسی لئے تم کو پورے نمبر ملے، اب تم کو میری طرف سے انعام بھی ملنا چاہئے، پھر حضرت نے کچھ نقد اور کچھ کتابیں انعام کے طور پر عنایت فرمائیں۔ ایک حقیر طالب علم کی کاپی اور انداز کیا، من آنم کہ من دانم، مگر اس واقعے سے حضرت کی خردنوازی اور تشجیع کی ادا بہت نمایاں ہوتی ہے۔

احقر نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء میں تخصص ادب عربی میں داخلہ لیا، ابتدائی مرحلے میں اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں بہت چیزیں منتقل کیں، اخباری تراشوں کے بجائے میں نے اپنے اکابر اور اساتذہ کے افادات کی تعریب پر خاص توجہ رکھی، چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی مایہ ناز کتاب ''علوم القرآن'' کا عربی ترجمہ کیا جو استاذ گرامی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب دامت برکاتہم نے ازراہِ شفقت ''البعث الاسلامی'' میں مکمل بالاقساط اپنی اصلاح کے بعد شائع فرمایا۔

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ کا ایک رسالہ ''فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے'' مجھے بے حد پسند آیا، میں نے لگے ہاتھوں اس کا بھی ترجمہ کر دیا جو دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے عربی ترجمان '' النهضة الإسلامية'' اور جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد کے عربی آرگن '' الحرم'' میں طبع ہوا، اس کے بعد سفرِ دیوبند کے موقع سے ناشتے کے وقت حضرت کی اجازت سے درِ دولت پر حاضری ہوئی، اور یہ مضمون ''ہدیۂ مور پیش سلیماں'' کے طور پر پیش کیا، تو حضرت نے دسیوں صفحات کا یہ مضمون اسی مجلس میں مکمل پڑھا اور پھر فرمایا: ''ماشاء اللہ: تمہاری عربی سلیس ہے، مشق خوب جاری رکھو، اور ''زوائد'' کے بجائے اس طرح کی علمی چیزوں کا ترجمہ کرتے رہو''۔

حضرت کے ان کلمات سے اور پھر دعائیہ جملوں سے دیر تک احقر پر سرشاری اور بے حد فرحت وانبساط کی کیفیات طاری رہیں۔

کرناٹک کے ایک سفر میں کئی دن حضرت کے ساتھ رہنے کی سعادت میسر آئی، یہ سفر ''تحفظ شریعت'' کی ایک کانفرنس کے لئے تھا جس میں کئی نشستیں صرف علماء کرام کی موضوعاتی تربیت کے لئے اور ایک نشست عوامی اجلاس کی تھی، حسن اتفاق سے منتظمین اجلاس نے احقر کی قیام گاہ کا نظم حضرت کی جائے قیام سے بالکل متصل کیا تھا، اس موقع پر انفرادی نشستوں، اجتماعی مجلسوں، خطابات ومحاضرات میں مکمل شرکت کے ساتھ، دسترخوان پر ہم طعامی کا شرف بھی حاصل ہوا، اور سچی بات یہ ہے کہ بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور حضرت کی بلند نگاہی اور سادہ مزاجی کے نقوش ذہن ودماغ پر مرتسم ہوئے، علمی محاضرات کے سلسلے میں جو عنوان اس حقیر سے متعلق کیا گیا تھا، اس پر میں نے بالارادہ اور منتظمین سے گذارش کر کے ترتیب یہ رکھی تھی کہ میری ٹوٹی پھوٹی گفتگو حضرت کی استراحت کے اوقات میں ہو، مگر اجلاس عام میں احقر کو بڑی آزمائش کا سامنا ہوا، حضرت شروع میں ہی اسٹیج پر تشریف لے آئے، کلیدی خطاب آخر میں آپ کا ہی ہونا تھا، احقر کو ''اصحاب رسول کی علمی وعملی عظمت اور اس سلسلے میں امت سے شریعت کے مطالبات'' پر چالیس منٹ خطاب کرنا تھا، بالآخر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ تمام ہوا، میری بے ربط اور ناقص گفتگو جاری تھی اور حضرت میری طرف مکمل متوجہ، اس صورت حال نے مجھے ''آزمائش در آزمائش'' سے دوچار کر دیا تھا، چونکہ مجمع میں ایک بڑا طبقہ ان افراد کا بھی تھا جن کے ہاں متعدد معتبر احادیث کو بھی ''ضعیف'' کے خانے میں ڈال دینے کا مزاج نمایاں ہوتا ہے، اس لئے ان کی رعایت بھی احقر نے ملحوظ رکھی تھی، اور عظمت صحابہ کے اثبات کے لئے خطبہ میں بھی اور خطاب کے دوران بھی مشہور حدیث '' أَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ'' کے بجائے صحیح مسلم کی روایت ''أَنَا أَمَنَةٌ لِأَصْحَابِیْ وَأَصْحَابِیْ أَمَنَةٌ لِأُمَّتِیْ الخ'' کو پیش کیا تھا اور اسی کی روشنی میں امت کی ذمہ داریوں اور صحابہ سے وابستگی کے صلے میں حاصل ہونے والی تائید الٰہی، امان وحفاظت ونصرت اور فتنوں سے سلامتی کا تذکرہ کیا تھا، حضرت نے از راہِ خرد نوازی اپنے کلیدی خطاب میں اپنے اس حقیر وتہی دامن شاگرد کی تحسین بلند الفاظ میں فرمائی تھی اور پھر اجلاس کے بعد دسترخوان پر حضرت نے بشاشت کے عالم میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا:

''تم نے حسب موقع اہم ترین حدیث کو بنیاد بنایا، اور مغز ہی مغز پیش کیا، ایسی ہی بات ہونی چاہئے، اسی کی مشق رکھو کہ مغز ہی بیان کرنا ہے، مضبوط بات ہی پیش کرنی ہے، چھلکا اور کچی بات نہیں پیش کرنی ہے۔''

ظاہر ہے کہ کہاں حضرت کا مقام بلند اور کہاں یہ طفل مکتب اور کودک ناداں: مگر یہ حضرت کا بڑکپن اور اندازِ تشجیع تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس ادا سے مخاطب کی کیسی دل بستگی ہوتی تھی اور اس کی رگوں میں جہد مسلسل کے لئے کیسے خونِ تازہ دوڑ پڑتا تھا، اسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے، الفاظ کے پیکر میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔

دورۂ حدیث کے سال میں ایک دن سبق سے فارغ ہونے کے بعد حضرت تخت سے نیچے اترے، استاذ کی دائیں جانب دوسری تپائی پر احقر کی نشست ہوتی تھی، آپ گذرے اور میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے، میرا معمول حضرت کی درسی تقریر من وعن کاپی میں ضبط کا تھا، میں اسی میں مشغول تھا، حضرت رک کر دیکھنے لگے، طلبہ متوجہ ہوگئے، میں نے آہٹ محسوس کی تو مرعوب ہوکر کھڑا ہوگیا، حضرت نے خیریت دریافت کی، بات کرتے ہوئے چل پڑے، میں بھی ساتھ ہوگیا، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کی خیریت پوچھی اور فرمایا: تمہیں شاید معلوم نہ ہو، تمہارے والد کا دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوگیا تھا، معاملات طے پاگئے تھے، کتابیں نامزد ہوگئی تھیں، مگر وہ نہ آسکے، تو پھر میرا تقرر ہوا، اس طرح میں تمہارے والد کی جگہ پڑھا رہا ہوں۔

میں بتا نہیں سکتا کہ حضرت کے ان الفاظ اور خردنوازی کے اس انداز نے کس طرح سے مجھے گھائل کیا اور حضرت کی عظمت ومحبت نہاں خانۂ قلب میں کس طرح پیوست ہوتی چلی گئی۔

اب ان یادوں کو قرطاس پہ منتقل کررہا ہوں تو احساس ہورہا ہے کہ ؏ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

(۳) تربیت کا بے مثال اہتمام

حضرت کی زندگی میں اپنے متعلق ومنسلک افراد کی تربیت کا خاص اہتمام تھا، اور اس میں حضرت کا انداز پدرانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی ٹیم ہے جو آپ کے فیضان تربیت سے کندن بنی، اور جس نے حضرت سے وابستگی اور حضرت کے زیر تربیت رہنے کو اپنے لئے مایۂ عزت وافتخار سمجھا، اور اس کی برکت سے اسے علمی وعملی برکات وفتوحات کے خزانے میسر آئے۔

ان سطروں کے راقم کو- اپنی تمام ترکم علمی کے باوجود- کسی نہ کسی درجے میں یہ خوش نصیبی حاصل رہی، میں اپنی غیر مطبوع یا مطبوع کوئی کاوش جب بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا تو اس کا ایک حصہ تو آپ اسی وقت ملاحظہ فرماتے، باقی بعد میں دیکھتے، اور جو کمی یا خامی نظر آتی فوراً متنبہ فرماتے، اصلاح کرتے، مضمون کو کیسے ادا کیا جائے، رہنمائی فرماتے اور کون سے مراجع پیش نظر رہیں، رہبری کرتے۔

اس حقیر نے ''اہل علم کے مجمع میں ہونے والے اپنے ایک مفصل خطاب ومحاضرہ'' کو بعض ذمہ دار اہل علم کی توجہ دہانی پر کتابی شکل میں ''فقہ حنفی میں اتباع احادیث کا جائزہ'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا، ارادہ یہ تھا کہ یہ کتاب حضرت کی نظر ثانی اور کلمات مبارکہ کے بعد ہی طبع ہوگی، دیوبند حاضر ہوکر کتاب کا مسودہ خدمت میں پیش کیا اور درخواست رکھ دی، حضرت نے ازراہِ ذرہ نوازی گذارش قبول فرمائی اور فرمایا: تین دن بعد ٹیلی فون پر بات ہوگی۔ تین دن بعد میں نے رابطہ کیا تو حضرت نے فرمایا:

''تم اسلامیات پر اچھا لکھتے ہو مگر خلافیات پر اچھا لکھنے کے لئے ابھی اور ریاضت درکار ہے۔''

اس اصولی بات کے بعد آپ نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے نمبر وار نشان دہی فرمائی اور اصلاح وترمیم کے بعد دوبارہ دکھانے کو کہا، میں نے حسب ہدایت واصلاح کام پورا کیا اور پیش کیا، حضرت نے بہ نظر غائر ملاحظہ فرمایا اور فرمایا:

''اب میں حضرت عمر کا قول دہراتا ہوں: اَلآنَ اِسْتَرَحْتُ (اب مجھے راحت ملی)۔''

پھر خوب دعاؤں سے نوازا، تقریظ لکھی، جس میں اس حقیر کے لئے از راہِ خردنوازی تحسین کے خوب کلمات ارقام فرمائے، سوء اتفاق یہ کتاب اب تک بعض اسباب سے زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔

یہ حقیر دار العلوم الاسلامیہ بستی میں تدریسی خدمات سے وابستہ تھا، جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد میں ہنگامی تدریسی ضرورت پیش آئی، جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا معین الدین گونڈویؒ علاج کے سلسلے میں گجرات منتقل ہو گئے تھے، بڑوں کے حکم پر ۲۰۰۶ء کے اوائل سے مجھے ''صحیح بخاری'' کی خدمت کے لئے مرادآباد آنا پڑا، یہ خدمت -اپنی تمام تر نااہلی کے باوجود- بڑوں کے امتثال حکم میں تاحال جاری ہے، اللہ اسی خدمت پر خاتمہ بخیر فرمائے۔

اس خدمت سے وابستگی کے بعد یہ حقیر پہلی بار دیوبند حاضر ہوا، اور حضرت کی بارگاہ میں پہونچا اور پوری بات عرض کی تو حضرت نے فرمایا: تم نے اس سے پہلے کون سی کتابیں پڑھائی ہیں؟ میں نے بطور خاص کئی سال سے ''مشکوۃ المصابیح'' پڑھانے کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا: دیگر فنون کی کیا کتب زیر درس رہی ہیں؟ میں نے نحو، صرف، ادب وانشاء اور فقہ وتفسیر تمام فنون کی اپنے زیر درس رہ چکی کتب کی تفصیل عرض کی، یہ سن کر حضرت نے دو باتیں فرمائیں:

(۱) تم نے معقول کی کتابیں پہلے پڑھائی ہیں، اب تم معقول سے گزر کر منقول کی طرف آئے ہو، یہ فالِ نیک ہے، میرا تجربہ ہے کہ یہ ترتیب ہر قدم پر فکری وعملی گمراہی سے محفوظ رکھتی ہے اور مسلکِ حق پر ثابت قدم رکھتی ہے۔

(۲) دورۂ حدیث کی تمام کتب کا از اول تا آخر بالاستیعاب مطالعہ کر ڈالو، بخاری کے لئے دیگر شروح کے ساتھ بالالتزام ''فیض الباری'' بہ غور دیکھو، پڑھانے میں ''تفصیل واختصار یا درایت وروایت'' کے حوالے سے ''اعتدال'' اور ''خَیْرُ الْکَلامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ'' کے طریقے کی پابندی رکھو، طلبہ کو ان کے معیار سے آگے کی بات نہ بتاؤ، وہی خوراک دو جو وہ ہضم کر سکیں، یہ دعا بھی اپنے لئے اور ہم سب کے لئے کرتے رہو کہ دین اور حدیث کی خدمت میں عمر تمام ہو جائے۔

گذشتہ دو یا تین سال قبل احقر ''رابطہ مدارس اسلامیہ'' کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں دیوبند گیا تھا، اجلاس کے بعد مہمان خانے میں لفٹ سے اترتے ہوئے حضرت سے ملاقات کی، حضرت نے خیریت دریافت کی، اسی وقت دولت کدے پر لے گئے، تحفۃ القاری مکمل اور ہدایت القرآن کی کئی جلدیں عطا فرمائیں اور فرمایا:

''عمامہ سنت ہے، تم حدیث پڑھاتے ہو، اب عمامہ باندھنا شروع کردو، روز نہ باندھ سکو تو جمعہ کے دن باندھ لو، یہ سنت کسی نہ کسی شکل میں حدیث کے خادم کی زندگی میں باقی و جاری رہنی چاہیئے۔''

احقر کو ایک مسئلے میں علمی اشکال تھا، عرض کیا، حضرت نے مفصل جواب دیا اور اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت کیا۔

احقر نے اپنی کتاب ''اسلام میں عفت وعصمت کا مقام'' میں ''آیت حجاب'' پر لکھا تھا، حضرت نے ملاحظہ فرمایا اور دیر تک اس موضوع پر گفتگو فرمائی، اس دن عصر کے بعد مجلس میں مجمع بھی زیادہ تھا، کئی اساتذۂ دارالعلوم بھی تشریف رکھتے تھے، پوری مجلس میں یہی موضوع رہا، مغرب کی نماز ساتھ ادا کی، اس کے بعد بھی کئی منٹ اسی موضوع پر بات کی اور بہت نفیس نکتوں کی طرف توجہ دلائی، حوصلہ افزائی بھی کی، تحسین بھی فرمائی اور تربیت واصلاح بھی کی۔

(۴) حفظان صحت کے اصول کا اہتمام

حضرت کے ہاں حفظان صحت کے حوالے سے بھی خاص اہتمام اور توجہ تھی، متعلقین کو اس پہلو سے توجہ دلاتے رہتے تھے، وقت پر سونا، کھانا پینا اور تمام کام، بہ جائے خود تحفظ صحت کے لئے بنیاد کا مقام رکھتے ہیں، حضرت اس پر پوری طرح کاربند رہتے تھے اور کبھی اس میں تخلف نہیں آنے دیتے تھے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کا مستقل معمول روزانہ بعد فجر کم از کم ایک گھنٹہ بہت تیز قدموں سے چلنے کا تھا (عموماً اس دورانیے میں وہ ۵ رکلومیٹر تفریح کر لیتے تھے اور چونکہ تفریح تنہا کرتے تھے اس لئے قرآن کے اچھے خاصے حصے کی تلاوت اور تسبیحات کا اپنا معمول اسی دوران مکمل کر لیتے تھے) میرے دورۂ حدیث کے سال (۱۹۹۶ء) میں حضرت والد صاحب کی حضرت مفتی صاحب سے سالہا سال کے بعد ملاقات ہوئی، والد صاحب نے اپنی تفریح اور چہل قدمی کا ذکر کیا تو پہلے مفتی صاحب نے ازراہ مزاح فرمایا:

''آپ مہتمم آدمی ہیں، آپ کے پاس وقت ہے، میں تو مدرس ہوں، یہی مطالعے کا وقت ہوتا ہے، میں اتنی لمبی تفریح نہیں کر سکتا۔''

پھر فرمایا:

''میں دن میں ایک بار اور بعد مغرب ایک بار اپنے گھر سے (جو دارالعلوم سے کافی فاصلے پر ہے) دارالعلوم پیدل جاتا اور آتا ہوں، اس طرح اچھی خاصی چہل قدمی ہو جاتی ہے۔''

ظاہر ہے کہ حضرت کے پیدل آنے جانے کا یہ معمول (جو علالت اور امراض کے ہجوم سے پہلے تک سالہا سال جاری رہا) حفظان صحت کی رعایت کے پیش نظر ہی تھا۔

ایک مرتبہ دیوبند حاضری کے موقع پر احقر نے اپنی کچھ تحریری کاوشیں پیش کیں، حضرت نے فرمایا:

''تم زمین پر بیٹھ کر لکھنے کا کام کرتے ہو یا کرسی اور میز کا استعمال کرتے ہو''۔

میں نے کرسی کا ذکر کیا، حضرت نے فرمایا:

''مستقل بیٹھ کر کام کرنا بسا اوقات مختلف پہلوؤں سے صحتِ جسمانی کے لئے بہت مضر ہوتا ہے، اس لئے یا تو کرسی میز کا استعمال ہونا چاہئے، یا اگر زمین پر بیٹھ کر کام کرنا ہے تو پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وقفہ دینا چاہئے اور اٹھ جانا چاہئے''۔

مزید فرمایا:

''میں زمین پر بیٹھ کر کام کرتا ہوں اور مراجع (جن کی ہر دم ضرورت ہوتی ہے) اپنے قریب نہیں رکھتا، دوالماریوں میں رکھتا ہوں، اور اس بہانے بار بار اٹھتا ہوں، تاکہ صحت پر منفی اثر نہ پڑے''۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روحانی صحت کے ساتھ اللہ نے حضرت کو جسمانی صحت کے تحفظ کی بھی خوب فکر عطا فرمائی تھی۔

(۵) تواضع

حدیث نبوی کی صراحت کے مطابق تواضع میں انسان کی رفعت کا راز چھپا ہوتا ہے، حضرت مفتی صاحب کو عالمی مقبولیت اور قافلۂ علم کی سالاری کا مقام بلند اور ''حسن قبول'' کا مرتبہ حاصل تھا، اس کی پشت پر دیگر محرکات کے پہلو بہ پہلو آپ کے اندرون کی تواضع، بے نفسی اور خاکساری بھی کلیدی طور پر شامل ہیں۔

اپنے معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف انسان کی وسیع الظرفی، تواضع اور اخلاص باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم (جو حضرت مفتی صاحبؒ کے معاصر بزرگوں میں ہیں اور علم وفضل کے حوالے سے پورے عالم کے علمی افق پر آفتابِ عالم تاب اور ''تو چیزے دیگری'' کا مصداق کامل ہیں) پر قاتلانہ حملے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے اپنے دوسطری تأثرات کا اظہار فرمایا تھا، یہ تأثر ایک طرف طویل تأثراتی اور جذباتی مضامین پر ہزار درجہ بھاری بھی ہے اور دوسری طرف حضرت مفتی صاحب کے صفائے باطن، معاصر کے فضل کے بے لاگ اعتراف اور تواضعِ کامل کا نمایاں ثبوت بھی ہے۔

اس تأثر کا عنوان تھا ''ہزار جانیں آپ پر قربان''

اور مضمون یوں ہے:

”تہنیت بخدمت سید المسلمین شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ادام اللہ فضلہ
آپ سرمایۂ ملت ہیں، اور مایہ پر ہمیشہ چوروں کی نظر رہتی ہے، مگر اَللّٰـهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ، اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے حملے سے آپ کو بال بال بچالیا، اس پر ہم ارحم الراحمین کا شکر بجالاتے ہیں“۔ (البلاغ: شعبان ۱۴۴۰ھ اپریل ۲۰۱۹ء: ص ۷۵)

حضرت مفتی صاحب کی رحلت پر تأثرات رقم کرنے والے ان کے متعدد تلامذہ نے نقل کیا ہے کہ مختلف تالیفی ذوق رکھنے والے علماء کو حضرت یہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنی علمی اور قلمی کاوشیں حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ (جو حضرت کے ہم عصر بلند پایہ عالم اور استاذ الاساتذہ تھے) کو ضرور دکھایا کریں، اس لئے کہ زبان وادب کے حوالے سے موصوف کی شخصیت بہت اہم اور سند ہے، ظاہر ہے کہ معاصرین کے کمال کا یہ اعتراف واظہار بجائے خود حضرت مفتی صاحب کی خوئے متواضعانہ اور پاکیزگی قلب واندرون کی بیّن دلیل ہے۔

(٦) غیبت اور بدگوئی سے مکمل اجتناب

حضرت کو اللہ نے یہ خوبی عطا فرمائی تھی کہ آپ کے دروس، خطابات، مجالس اور نشستیں ”غیبت اور بدگوئی“ کے رواجِ عام پاچکے رذائل سے بالکل محفوظ اور پاک رہتی تھیں، ذاتیات پر تبصرہ اور معائب کے پروپیگنڈہ سے وہ کوسوں دور رہا کرتے تھے، ان کو اپنے باتوفیق اور اہل دل اساتذہ کے فیض صحبت وتربیت سے، اپنے والدین کے صلاح وتدین اور حسن تربیت، متواتر دینی خدمت اور علمی اشتغال نیز اپنے مرتب اور جامع ومنضبط نظام الاوقات کی برکت سے غیبت وبدگوئی جیسے سفلی کاموں سے نفرت تھی، انہوں نے علمی موسوعاتی کاموں کا ایسا بیڑا ہمیشہ اٹھائے رکھا کہ ان کی زندگی میں کبھی ان جیسے کاموں کی فرصت بھی نہیں تھی۔

ان کے مفسرانہ قلمِ فیض رقم نے ”غیبت“ کے ذیل میں لکھا ہے:

”پھر غیبت کی تغلیظ (بھاری گناہ ہونا بیان کرنے) کے لئے اس کو تشبیہ دی مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے، جس سے ہر کوئی گھن کرتا ہے، کوئی اس کو کھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اور مردہ بھائی کے گوشت کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ زندہ بھائی کا گوشت اول تو کوئی کھا نہیں سکتا، اور کھانے کی کوشش کرے تو وہ مدافعت کرے گا، اور لاش کو کھائے تو کون مدافعت کرے گا؟ اسی طرح دوسرے کی عدم موجودگی میں غیبت کرے تو وہ کیا مدافعت کرے گا؟ ہمت ہو تو سامنے برائی کرکے دکھائے، اس صورت میں منھ کی کھائے گا“۔ (ہدایت القرآن: ۷/ ۵۰۶)

واقعہ یہ ہے کہ ان کا حال ان کے قلم وقال کے مطابق غیبت، بدزبانی اور بدگوئی سے بالکل پاک اور سلامت تھا، وہ اپنے خوردوں کا بھی غائبانے میں ذکر خیر کرتے تھے، اصلاح طلب امور کی اصلاح سامنے اور مشفقانہ مربیانہ اصولی لہجے میں فرماتے تھے، اور یہ ان کی عظمت کی بہت کھلی دلیل تھی۔

(۷) جادۂ اعتدال پر ثابت قدمی

حضرت کی کتاب زندگی کا نمایاں عنوان ''اعتدال'' ہے، یہ اعتدال دروس وخطابات میں بھی نمایاں رہتا تھا، شخصیات سے اظہار تعلق میں بھی دکھائی دیتا تھا، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک، خلوت سے لے کر جلوت تک اور سفر وحضر ہر جگہ اس اعتدال کا عکس نظر آتا تھا، ان کی ''حق گوئی'' اور ''تصلّب'' کچھ ظاہر بینوں کو ''غلو'' نما معلوم ہوتے تھے، مگر یہ سطحی مشاہدہ کی وجہ سے ہوتا تھا، ان سے قریب ہوکر، ان کی مجالس میں شریک ہوکر اور ان کے ساتھ کچھ وقت گذار کر بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ ''غلو'' سے کس قدر نفور اور ''اعتدال'' کے کس درجہ پیکر ہیں۔

حضرت کے اسباق علمیت کا مظاہرہ کرنے والے نو واردوں کی طرح اطناب وتطویل سے بھی پاک تھے، اور حقِ علم ادا کرنے کے بجائے صرف ایک بوجھ اتارنے والوں کی طرح ایجاز واختصار اور سرسری انداز سے بھی محفوظ تھے، آپ کے دروس ''اطنابِ مِمل'' (اکتادینے والی بلکہ بسا اوقات افادیت سے خالی تفصیل وتطویل) اور ''ایجازِ مُخل'' (مضمون کو خبط کردینے والے اختصار) دونوں سے پاک سراپا اعتدال تھے، اور سال کی ابتداء سے انتہا تک یہ اعتدال اور یکسانیت باقی رہتی تھی۔

یہی اعتدال حدیث کی عبارت خوانی میں بھی ہوتا تھا، احادیث کے متون نہ اتنے تیز پڑھے جاتے کہ واضح نہ ہوسکیں، اور نہ اتنے اطمینان سے پڑھے جاتے کہ ترتیل کا گماں ٹھہرے، بلکہ میانہ روی کا مکمل لحاظ رہا کرتا تھا۔

حضرت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ''اکابر پرستی'' اور ''اکابر بیزاری'' کی انتہاؤں سے الگ اور دور شاہراہ اعتدال پر گامزن رہتے تھے، عقائد وکلامیات میں انہیں اکابر کی تشریح پر کامل اعتماد تھا، اور ان کا دل اکابر کے سچے احترام سے ہمہ وقت لبریز رہتا تھا، مگر اس کے باوجود وہ اکابر کی ہر ہر بات پر آنکھ بند کرکے یقین، دوسرے لفظوں میں اندھی تقلید کے قائل کبھی نہیں رہے، بصیرت ان کے علمی وفکری سفر میں ہمیشہ ان کا زادِ راہ رہی۔

اپنے بعض معاصرین (جن سے متعدد علمی وفکری مباحث میں ان کا اختلاف رائے رہا کرتا تھا) کے ساتھ ان کے معاملات اور سلوک ورویے ہمیشہ اعتدال کا نمونہ رہے، اختلاف رائے انہیں معاصرین کی خوبیوں کے اعتراف سے کبھی نہیں روکتا تھا، وہ اپنی رائے پر قائم بھی رہتے تھے، اس کی وکالت بھی کرتے تھے، اور مخالف دلائل کا جواب بھی دیتے تھے، مگر مقابل کی تحقیر وتنقیص سے ہمیشہ اپنے قلب وقالب دونوں کو محفوظ بھی رکھتے تھے، اس جوہر اعتدال نے ان کو امتیازی خوبی عطا کردی تھی، آج یہ خوبی نایاب ہوتی جارہی ہے، حضرت کی حیات کا یہ ورق ان کے تمام اخلاف کے لئے اس حوالے سے خصوصیت کے ساتھ مشعل راہ ہے، اور ہم سب کو ''ادب الخلاف'' (اختلاف رائے کا شائستہ طریق) سیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

(۸) حق گوئی، استقامت اور تصلّب

حضرت مفتی صاحب کی سیرت کا سب سے جلی اور روشن پہلو (جو انہیں اپنے معاصرین میں نمایاں امتیاز عطا کرتا ہے) ان کی حق گوئی، استقامت اور تصلّب کی خصوصیت ہے، وہ ہمیشہ حق کا اعلان ڈنکے کی چوٹ پر کرتے تھے، انہیں عواقب اور لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی، حق گوئی کی جرأت رندانہ رکھنے والے اور اس راہ میں ہر صعوبت انگیز کرنے کا جگر رکھنے والے اسلاف کی طرح ان پر نہ کبھی مرعوبیت طاری ہوتی تھی، نہ مصلحت آمیز اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کا خیال بھی آتا تھا۔

ان کی ساخت اور ترکیب جن عناصر سے ہوئی تھی ان میں اپنے کو صلح کل بنائے رکھنے اور ''متفق علیہ'' اور ''غیر متنازع'' بنے رہنے کے لئے تلخ کو شیریں اور غلط پر خاموش رہ جانے اور حق کو مشتبہ کر دینے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں تھی، وہ انکار منکر اور ابطال باطل کو وقت گذاری کا مشغلہ یا اپنی دلچسپی کا موضوع نہیں، اپنا مشن اور فرض منصبی باور کرتے تھے، جس چیز کے حق اور درست ہونے پر منصوص و مضبوط دلائل کی روشنی میں انہیں انشراح ہو جاتا تھا، وہ اس کا اظہار کرنے سے نہ گریز کرتے تھے، اور نہ مخالفانہ رائے رکھنے والوں کی وجہ سے اس کے اعلان میں انہیں کوئی باک ہوتا تھا، ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ کبھی زہر ہلاہل کو قند نہیں کہہ سکتے تھے، حق گوئی ان کی سرشت تھی، احقاق حق ان کی طبیعت تھی، ابطال باطل ان کا مزاج تھا اور انکار منکر ان کا ہدف تھا، وہ اپنی مثال آپ تھے، انکار منکر اور ابطال باطل کے حوالے سے جب وہ مجلس یا اجلاس میں گفتگو کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ ان میں کوئی فولادی قوت پیدا ہو گئی ہے، ان کا اسلوب بالکل بے لچک اور دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح ہو جاتا تھا، ان کی زبان قال حق کا اعلان اور منکر کا انکار کر رہی ہوتی تھی اور زبانِ حال گویا یہ کہہ رہی ہوتی تھی ؎

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

اور ان کا انداز یہ صدا لگا رہا ہوتا تھا ؎

یہ بیانِ حال یہ گفتگو، ہے میرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو، نہ سنو گے ایسی کہانیاں

قبرستانوں میں لگائے جانے والے کتبوں کے تعلق سے حلقۂ دیوبند میں جو غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے، وہ حضرت کے لئے بڑی فکر اور کڑھن کا باعث تھا، وہ کھل کر اس پر نکیر کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا کہنا تھا کہ بریلویت اور دیوبندیت میں اب صرف ایک بالشت کا فرق رہ گیا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اب یہ فرق بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

مروجہ تعزیتی جلسوں اور مجالس کے بارے میں حضرت کا موقف بالکل واضح تھا، وہ ان کو غلط اور نا مناسب باور کرتے تھے، ان کا موقف مختلف دلائل کی روشنی میں یہ تھا کہ اس سلسلہ میں بعض پیش رو اکابر کی طرف سے اس طرح کے اجلاسات کے انعقاد اور شرکت کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا، اکابر کے تمام تر احترام کے باوجود حضرت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ مسئلہ ان اکابر کے سامنے منقح نہیں ہوا تھا، اس لئے تنقیح سے پہلے کے ان کے عمل کو ثبوت میں نہیں پیش کیا جانا چاہیئے۔

''چھوٹا منہ بڑی بات'' سہی، مگر یہاں یہ عرض کیا جانا ضروری ہے کہ تعزیتی مجالس کے سلسلے میں مسلک دیوبند کے نمائندگان کا باہم اختلاف حق وباطل، درست ونادرست، صحیح اور غلط کا نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ اختلاف عزیمت ورخصت یا انسب وغیر انسب کے درجے کا ہے، حضرت مفتی صاحب راہِ عزیمت کے سالک بلکہ رہبر تھے، اس لئے بجا طور پر ان کا وہی موقف ہونا چاہیئے تھا جو انہوں نے پوری قوت سے ظاہر فرمایا۔

جماعت تبلیغ میں اور بہ طور خاص اس سے متعلق دین کے عمیق علم سے ناآشنا پرجوش افراد کی طرف سے مختلف جہات میں پایا جانے والا غلو (جس کے ڈانڈے دین کے صرف ایک شعبہ کی تعظیم اور باقی شعبوں اور محاذوں کی قدر ناشناسی سے مل جاتے ہیں) اسی طرح ''فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح کو کار تبلیغ پر منطبق بلکہ منحصر کردینے اور جہاد وقتال جیسے اہم دینی شعبے کی حق تلفی پر مبنی بے اعتدالی، نیز بعض ذمہ دارانِ جماعت کی طرف سے تفسیر آیات اور تشریح احادیث وغیرہ میں صادر ہونے والی لغزشیں اور ان پر کسی نہ کسی صورت میں اصرار کی روش حضرت مفتی صاحب کے لئے بڑے قلق اور تشویش کی بات تھی، ایسے مواقع پر ان کا احقاق حق اور تصحیح غلط کا جذبہ خوب بیدار ہوجاتا تھا، اور وہ اپنے تلامذہ کو بطور خاص دروس میں اور حسب ضرورت عمومی مجالس میں شرکاء کو متنبہ بھی فرماتے تھے، اور اسے اپنی دینی مسئولیت سمجھتے تھے۔

قبرستانوں میں مراقبہ، قبروں پر تلاوت، تصوف کے نام پر افراط وتفریط اور اکابر پرستی میں غلو وہ امور ہیں جن پر حضرت مفتی صاحب نے کھل کر نکیر کی ہے، ان میں سے بعض معاملات میں بعض جزئیات پر حضرت مفتی صاحب کے نقد واحتساب سے متعدد علماء ومشائخ کو اتفاق نہ ہوسکا، مگر حضرت مفتی صاحب نے دلائل کی روشنی میں جس عمل کو درست نہیں سمجھا اور خیر القرون میں جسے متوارث نہیں پایا اس پر احتساب کا فرض ضرور انجام دیا۔

حضرت کو حلقۂ دیوبند سے منسلک مدارس میں قرآن مجید سے بے اعتنائی پر بہت دکھ ہوتا تھا، واضح رہے کہ درس نظامی میں تفسیر کے نام پر صرف ایک کتاب ''جلالین'' داخل نصاب ہے، حضرت فرماتے تھے:

> ''ہمارے ہاں سب سے زیادہ مظلوم قرآن ہے، دیگر تمام فنون پر کئی کئی کتب داخل نصاب ہیں، مگر قرآن کے نام پر صرف ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔''

حضرت کی رائے یہ تھی کہ نفس قرآن شرح وبسط کے ساتھ اس طرح پڑھایا جانا چاہئے کہ استاذ کسی خاص تفسیر کو سامنے نہ رکھے، وہ تمام معتبر تفاسیر کو مرجع بنائے، ان کا مطالعہ کرے، اور حاصل مطالعہ کو تمام نکتوں اور افادات و مباحث کے ساتھ طلبہ تک منتقل کرے، اس کے بغیر طلبہ میں قرآن میں تدبر کا ذوق پیدا نہیں ہوگا۔

اسی طرح دورۂ حدیث کے سلسلے میں حضرت کی رائے یہ تھی کہ اس کے لئے ایک سال کا دورانیہ بالکل ناکافی ہے، دو سال ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے بغیر فہم حدیث نہیں ہوسکتا، نیز ہر کتاب سے بحث ودرایت کے لئے الگ الگ ابواب منتخب ہونے چاہئیں تاکہ کوئی پہلو تشنہ بھی نہ رہے، اور محض تکرار پر اکتفا بھی نہ ہو، (ایک سال سے دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ دورۂ حدیث میں تمام کتب مکمل پڑھائی جائیں، البتہ درایت و بحث کے لئے الگ الگ ابواب کا انتخاب کیا گیا ہے، خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو اور اس پر استقامت کے ساتھ اہل مدارس عمل کرسکیں)۔

کئی دہائی قبل دارالعلوم دیوبند کے یوم تاسیس پر سالانہ جشن کی بات آئی، تو حضرت نے دلائل کی روشنی میں پوری قوت سے اس کا رد بھی کیا، اہل انتظام کو توجہ بھی دلائی اور اسے بدعت کا پیش خیمہ بتایا بالآخر یہ بات ختم ہوئی۔

حضرت اپنے ان تلامذہ سے (جو مدارس اور اداروں میں اہتمام وانصرام کے منصب پر فائز ہوتے تھے) یہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ منصب آگ پر چلنے کے مرادف ہے، اگر یہ ہمت اور صلاحیت ہو تو اس پر باقی رہنا چاہئے ورنہ ع اگر خواہی سلامت بر کنارا ست (اس معنیٰ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا یہ فقرہ معروف ہے کہ منصب اہتمام مقامِ مبغوض ہے)۔

اسی رمضان ۱۴۴۱ھ میں وفات سے چند ایام قبل حضرت نے ''ثریا ستارہ اور کرونا وائرس'' کے حوالے سے جاری ایک بحث میں پوری وضاحت سے اپنا موقف پیش کیا اور ثریا کے طلوع کو کرونا کے خاتمے سے جوڑنے والی فکر کو قوت کے ساتھ رد فرمایا، آپ کا یہ رد اس درجہ مضبوط اور استدلالی تھا کہ مخالفانہ موقف رکھنے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ ثابت ہوا بلکہ ایک مخلص اور راسخ العلم شخصیت نے حضرت کے خطاب ورد کی روشنی میں اپنے موقف سے رجوع بھی کیا اور تواضع کا ثبوت دیتے ہوئے رجوع کا اظہار بھی کیا۔

تصویر سازی اور ویڈیوگرافی کے منکر پر حضرت مفتی صاحب اپنی مجالس سے لے کر بڑے بڑے عوامی اجتماعات میں قوت کے ساتھ نکیر اور اظہار حق کا فرض انجام دیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ایک طرف اہل افتاء اس کے ناجائز ہونے کے فتوے صادر کرتے ہیں، اور دوسری طرف ان کا اور دیگر متعدد اہل علم کا عمل اس کے خلاف سامنے آتا ہے، اس سے دین کی بے وقعتی اور شرعی احکام کی بے توقیری ہوتی ہے، ایسے ماحول میں جب اس حوالے سے بڑے بڑوں کا انداز سکوت کا ہو، اور مصالح پیش نظر ہوں، حضرت اپنی جرأت رندانہ، عزیمتِ عالمانہ اور بصیرت فقیہانہ کا

ثبوت دیتے ہوئے بار بار اس منکر کے خلاف اعلان حق کرتے تھے اور دعوتِ فکر و عمل دیتے تھے، گویا ان کا پیغام یہ تھا کہ ؎

کب سے ہوں نغمہ بلب، بزم کے سناٹے میں
کیا سنے ہے کوئی آواز، کوئی جاگے ہے

(۹) دلوں میں اتر جانے والا خطاب

حضرت مفتی صاحب باضابطہ اسٹیج کے آدمی نہیں تھے، ان کا خطاب جذباتی باتوں، شعلہ نوا انداز، تصنعات و تکلفات، آورد اور بناوٹ سے بالکل پاک ہوتا تھا، لب ولہجہ مجلسی ہوتا تھا، آمد ہی آمد کا منظر ہوتا تھا، الفاظ پر شکوہ نہیں ہوتے تھے، انداز پیشہ ورانہ نہیں ہوتا تھا، پھر بھی سامعین کا تأثر یہ ہوتا تھا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ ان کا امتیاز تھا کہ وہ اپنے خطاب میں موضوع (اور بالعموم موضوع علمی اور خشک ہوتا تھا) سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے، نہ لطیفے سناتے نہ اشعار پڑھتے، سنجیدہ اسلوب میں باوقار خطاب ہوتا تھا، مگر تاثیر قیامت کی ہوتی تھی، یہ ان کے اخلاص اور پاکیزہ باطنی کا اثر تھا۔

(۱) لب ولہجہ کی انفرادیت

(۲) بات پیش کرنے، موقف ثابت کرنے اور مدعا بیان کرنے کی بے مثال و مستحکم قوت

(۳) علمی مضامین کو سہل ترین انداز میں اور خشک ترین موضوعات کو تر و تازہ اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا خداداد سلیقہ

(۴) ایک مضمون کو ہر بار نئے پیرائے اور پیرہن میں بیان کرنے اور جدت پیدا کرنے کی خاص ادا

(۵) اس پر مستزاد موضوع کے تمام گوشوں کو سمیٹ لینے، حق ادا کرنے اور احاطہ و جامعیت کا ہنر

(۶) لب و لہجے میں اطمینان اور ٹھہراؤ اور عجلت سے گریز، ایک ایک حرف واضح، ایک ایک جملہ نمایاں

(۷) استدلالی رنگ، معقول و منقول دلائل کا اجتماع

(۸) اور ان سب کے ساتھ اجتہادی نہ کہ تقلیدی منفرد انداز وطرز

(۹) مزید برآں ''قلندروں کے طریق'' کے مطابق زبان و دل کی رفاقت، الفاظ دل کی آواز اور ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق

یہ سب حضرت کے خطاب کی خصوصیات تھیں۔

(۱۰) ان کے خطاب میں موضوع پر ارتکاز کے ساتھ سابق خطباء کی جادۂ اعتدال سے منحرف باتوں اور

فکروں کا شائستگی کے ساتھ مدلل رد بھی ہوتا تھا، اور اصلاح پر زور بھی، ہر خطاب حق گوئی کا شاہکار ہوتا تھا، اور ہنگامی حالتوں میں تو آپ کے خطاب کا رنگ دو آتشہ ہو جاتا تھا۔

دارالعلوم کے احاطہ میں ہنگامی احوال میں طلبہ کے درمیان ان کا خطاب ''مشتعل جذبات کی تسکین، دماغوں کی تسخیر، خیالات کی تطہیر، افکار کے تزکیہ، دلوں کی تسلی اور کایا پلٹ دینے'' کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔

فقہی، علمی اور کلامی مسائل میں بھی عوام کے درمیان آپ کا خطاب ایسے اسلوب میں ہوتا تھا جو ان کے ذہنوں کو اپیل کرتا تھا اور ان کے دماغوں کو حق پر مطمئن و منشرح کر دیتا تھا، اور ان کا یہ تأثر ہوتا تھا کہ حضرت کی باتیں گویا ان کے دلوں میں اترتی اور دماغوں میں جاگزیں ہوتی جا رہی ہیں، گویا ایک نہر سلسبیل جاری ہوتی تھی جو سامعین کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی تھی، ان کے یہ خطابات عوام اور عصری تعلیم یافتہ افراد کے دماغوں سے ''شریعت اسلامی، فقہ اسلامی، مسلک دیوبند، تقلید ائمہ وغیرہ'' کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کی گرد بالکل صاف کر دیا کرتے تھے اور ان میں ''اطمینان وانشراح'' کا تازہ لہو دوڑا دیا کرتے تھے۔

محفل و مجلس کوئی بھی ہو، اگر حضرت موجود ہیں تو وہی جان محفل اور میر مجلس ہوتے تھے، انہیں کا خطاب کلیدی، سب سے اہم اور فیصلہ کن ہوتا تھا، اور اب ان کے جانے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ؂

ساتھ عاجز کے گیا سوزِ سخن، سازِ سخن
پھر کوئی ایسا غزل خواں نہ زمانے سے اٹھا

(۱۰) بے مثال تدریس

حضرت مفتی صاحب کا اصل شغل، موضوع، مذاق و مزاج اور غذا ''درس و تدریس'' تھی، بلاشبہ وہ عبقری اور نابغۂ روزگار علماء اور معلمین میں تھے، دارالعلوم دیوبند کے حلقۂ تدریس میں کئی دہائیوں سے وہی ''ریڑھ کی ہڈی'' کا مقام رکھتے تھے، اور بلا مبالغہ پورے ملک میں علم و تحقیق کے کارواں کے سالار کا مرتبہ انہیں کو حاصل تھا، ان کی رحلت سے تدریس، علم اور تحقیق کی یہ مسند سونی ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ ماتم کناں ہے، مگر حضرت گویا یہ کہہ کر رخصت ہو چکے ع

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

حضرت جب حیات تھے، مسند درس کی رونق و آبرو تھے، پروانے ان کے گرد ہجوم لگاتے تھے، ان کا فیضان علمی مسلسل جاری رہتا تھا، ان کے سینے سے علوم و معارف کے موتی خوشہ چینوں کے سینوں اور سفینوں میں فروانی سے منتقل ہوتے تھے، ایک طبقہ اس وقت ان کے علمی اکتسابات اور نتائج تحقیق سے مطمئن نہ تھا، واہموں اور خدشوں کا شکار تھا (اگرچہ اس طبقے کے اخلاص اور فکر و تڑپ میں شک نہیں کیا جا سکتا) مگر حضرت ناقدین کے نقد کی پرواہ کئے بغیر ؂

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

کے مطابق ''وقت کم ہے اور کام زیادہ'' کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے علمی اور تحقیقی سفر میں اپنے اصل ہدف ومنزل کی طرف تیزی سے محوخرام رہے، ہاں مگر زبان حال سے یہ ضرور کہتے رہے۔

دلِ پرُغم نہیں ہوں گے، دیدۂ پرُنم نہیں ہوں گے
اندھیرا ہوگا اس محفل میں جس میں ہم نہیں ہوں گے

زمانہ قدر کر، ہاں قدر کر ہم کج کلاہوں کی
کہ پیدا اس نمونے کے جواں ہر دم نہیں ہوں گے

ذکر تھا حضرت کی بے مثال مدرسانہ اور معلمانہ شان کا، وہ ہر فن پر یکساں عبور رکھنے والے بے بدل عالم تھے، ہر فن کے مزاج شناس تھے، ہر فن کے مراجع ومصادر اور مآخذ واصول پر ان کی گہری نظر تھی، وہ درس نظامی کی تقریباً تمام کتب کا درس دے چکے تھے، نحو وصرف، منطق وفلسفہ، بلاغت وادب سے لے کر فقہ وحدیث وتفسیر تک کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں انہیں نبوغ ورسوخ کا مقام حاصل نہ ہو، تقریباً ہر فن پر انہوں نے خامہ فرسائی بھی کی ہے، نحو وصرف و منطق وفلسفہ پر انہوں نے درسی انداز کی ''سہل ممتنع'' اسلوب کی حامل نصابی کتب تیار کیں، الفوز الکبیر کا عربی ترجمہ کر کے اصول تفسیر کے موضوع پر خدمت انجام دی، ترمذی وبخاری وحجۃ اللہ وسراجی کی مبسوط شروح تیار کردیں، تفسیر پر وقیع کام انجام دیا، یہ خدمات ان کے ذوقِ علم وتدریس وتحقیق کی آئینہ دار بلکہ شاہ کار کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

ان کے درس کا رنگ کیا ہوتا تھا، وہ لکھنے، بیان کرنے اور سننے سے زیادہ دیکھنے اور براہ راست حاضری سے تعلق رکھتا تھا۔

(۱) اللہ نے انہیں گھول کر پلا دینے، پیچیدہ مباحث کی تسہیل اور سنگلاخ مباحث کو پانی کرنے کا بے مثال ملکہ اور ہنر ودیعت فرمایا تھا، مشکل سے مشکل بحث کو وہ انتہائی آسان لفظوں میں اور چٹکیوں میں حل کردیا کرتے تھے۔

(۲) علمی گہرائی وگیرائی اور عمق وبصیرت ان کی درسی تقریر کے ایک ایک فقرے سے نمایاں ہوتی تھی۔

(۳) متعلقہ موضوع کی جامعیت اور احاطہ واستیعاب ان کا خاص مزاج تھا۔

(۴) ان کا درس اعتدال کا نمونہ ہوتا تھا، پورے سال یکساں انداز، وہ اطناب وتطویل کے قائل نہیں تھے، اور بہت اختصار وایجاز کو بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے، میانہ روی کا رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، وہ موضوع کا پورا حق ادا کرتے تھے، کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے تھے، انہیں سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کا ہنر آتا تھا، اور اس ہنر کو وہ درس میں کامیابی سے آزماتے تھے۔

(۵) ان کا درس روایت ودرایت اور عقل ونقل کے امتزاج واجتماع کی خوب صورت مثال ہوتا تھا۔

(۶) موضوع پر ارتکاز، انحصار اور اِدھر اُدھر نہ بھاگنا ان کی خاص شناخت تھی۔

(۷) دوران درس ان کی گفتگو انتہائی مرتب ومدلل ہوتی تھی۔

(۸) وہ پوری تیاری اور مطالعے اور قابو یابی کے بعد ہی سبق پڑھاتے تھے، رواروی اور بوجھ اتار پھینکنے کو وہ خیانت باور کرتے تھے۔

(۹) ان کے درس میں مخاطب کی ترکیز سو فیصد ان کی طرف ہی ہوتی تھی، یہ ان کا ساحرانہ کمال تھا، طلبہ کے دل ان کی طرف کھنچتے تھے، سماعتیں ان کی صدائے دل نواز کی عاشق رہتی تھیں، اور بصارتیں ان کے سراپا کے دیدار کی آرزو مند رہتی تھیں، ان کے اسباق میں طلبہ کی توجہ وسکون کا حال ''کَأَنَّ عَلٰی رُؤُوْسِهِمُ الطَّیْرَ'' (گویا ان کے سروں پر پرندے ہوں) کی منظر کشی کرتا تھا۔

(۱۰) ان کے درس میں گویا علم کی بارش ہوتی تھی، نفیس افادات، نایاب نکتے، علمی جواہر، بیش قیمت فوائد اور دلوں کی کھڑکیاں کھول دینے اور دماغوں کے دریچے وا کر دینے والے حقائق و معارف، کیا کچھ نہ ہوتا تھا، اسی لئے تو وہ ''درس و تدریس'' کی سلطنت کے بے تاج بادشاہ کا مقام رکھتے تھے۔

(۱۱) ان کے درس کی سب سے منفرد ادا ان کا دل نشیں، مؤثر ترین اور بے نظیر انداز تفہیم تھا، وہ جس لہجے میں بات کہتے تھے، جس انداز سے موضوع پیش کرتے تھے اور جس اسلوب میں بحث کرتے تھے وہ بالکل جداگانہ ہوتا تھا، درس میں اول سے آخر تک ان کے دل نشیں انداز واسلوب کی شگفتگی باقی رہتی تھی، اور یہی رنگ نمایاں رہتا تھا، ہر ہر بات نہاں خانۂ دل میں اترتی اور دماغ میں محفوظ ہوتی چلی جاتی تھی۔

(۱۲) دوران درس مختلف مسائل میں اپنی رائے پیش کرنے کا مزاج بھی تھا، ان کے یہ تفردات (جنہیں قبول کرنے کا پابند کسی کو نہیں بناتے تھے، بلکہ طلبہ کو معروف اور اجتماعی رائے اور مسلک کا پابند رہنے کی تلقین کرتے تھے، اور یہ ان کے اخلاص کا بین ثبوت بھی تھا) اگرچہ دیگر اہل علم کے ہاں قابل قبول نہ بھی ہوں، ان کے علمی مقام بلند، وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق و تدقیق اور وفورِ علم کے لوازم میں سے ہیں، اور ان تفرادات پر بے جا نقد کرنے اور اپنا عدمِ اتفاق ظاہر کرنے کے بجائے انہیں اس تناظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ علمی سفر میں کتنی صعوبت آزما گھاٹیاں عبور کرنے اور کتنی ریاضتوں کے بعد حضرت کو یہ مقام ملا ہوگا، ''تفرداتِ علمی'' باعثِ تنقید ہونے کے بجائے باعثِ تحقیق اور دعوتِ مطالعہ وجہدِ مسلسل ہونے چاہئیں۔

حضرت کے معاصرین تو ہم سب کے بڑے ہیں، ان کا مقام بہت اونچا ہے، مگر ہم خردوں کو اپنی سمتِ سفر درست رکھنے کے لئے ''علمی تفردات'' پر چیں بہ جبیں ہونے اور بے اطمینانی کا اظہار کرنے کے بجائے ان کے بین السطور میں مضمر ''محنت اور مسلسل محنت'' کے زندہ و تازہ پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حضرت کے دروس اب صرف یادگار رہ گئے ہیں، جن کو ان سے تلمذ کی سعادت میسر نہیں آئی، ان کو تو ان دروس کا اصل رنگ دکھایا اور بتایا ہی نہیں جا سکتا، مگر جن کو تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور جن کی سماعتیں حضرت کے دروس

کی آوازوں سے شادکام ہوتی رہیں یقیناً ان سب کا حضرت کے بارے میں یہی تأثر ہوگا کہ ؎

مسلسل یاد آئیں گے، پیہم یاد آئیں گے
کوئی موسم رہے، بے قیدِ موسم یاد آئیں گے

(۱۱) جہد مسلسل اور انضباط اوقات

حضرت مفتی صاحب کی علمی عظمتوں کا اصل راز آپ کی ''جہد مسلسل'' اور انضباط اوقات کی خصوصیات ہیں، ان کی زندگی متواتر محنت، مسلسل ریاضت، مستقل کوشش اور تعب ناآشنا ذوقِ مطالعہ کے حوالے سے اسوہ ونمونہ ہے، انہوں نے دورطالب علمی سے لے کر تا دمِ زیست علمی اشتغال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، انہیں محفل پسندی، عیش کوشی، تن آسانی اور کام چوری سے کبھی مناسبت ہی نہیں رہی، انہوں نے محنت اور جفاکشی میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، کام اور صرف کام ان کا شعار رہا، دوران طالب علمی ''افتاء'' کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے اپنے ذوق اور محنت سے خود مکمل قرآن حفظ کیا، ان کا شوق مطالعہ اور کتابوں سے عشق ''وَخَیرُ جَلِیْسٍ فِیْ الزَّمَانِ کِتَابُ'' (زمانے میں سب سے بہتر ساتھی کتاب ہے) کی یاد تازہ کرتا تھا، عربی شاعر کے شعر ؎

بِقَدْرِ الْکَدِّ تُکْتَسَبُ الْمَعَالِیْ
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلیٰ سَھِرَ اللَّیَالِیْ

(محنت کے تناسب سے ہی عظمت ملتی ہے، عظمتوں کا طالب راتوں کو جاگتا اور محنت کرتا ہے) کے مطابق ان کی کاوش پیہم ہی ان کی عظمت ورفعت کا بنیادی سبب تھی۔

قرآن مجید کی آیت ''وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ أَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا'' (جب انہوں نے صبر سے کام لیا تب ہم نے ان کو پیشوا بنایا) سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کامل اور جہد مسلسل سے ہی پیشوائی اور امامت وسیادت کا مقام ملتا ہے، اسی لئے ''قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوْا'' (مقام سیادت ملنے سے پہلے بھی) اور ''بَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوْا'' (مقام سیادت ملنے کے بعد بھی) مستقل محنت وعلمی ریاضت کی تاکید آئی ہے۔ (بخاری: العلم)

حضرت نے مشکل حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہوئے صبر وجہد کی خو کبھی نہیں بدلی، ان کا یہ رنگ طالب علمی کے دور میں بھی رہا، مدرسی کے زمانے میں بھی رہا، شیخ الحدیث بننے کے بعد بھی رہا، وہ کسی مرحلۂ حیات میں محنت ومطالعہ سے غافل نہیں ہوئے، اور اسی وصف نے انہیں علمی سیادت وامامت کا یہ مقام بخشا کہ وہ ام المدارس کے صدرالمدرسین بھی ہوئے، شیخ الحدیث بھی بنے، علماء کے لئے مرجع ومرکز بھی بنے، قافلۂ علم کے میر وسالار بھی بنے، علماء کے لئے وقار اور شان بھی ثابت ہوئے، ہر طرف ان کا طوطی بولتا رہا، اور ہر جانب ان کا ڈنکا بجا، علامہ زمخشری کا یہ شعر حضرت کی علمی ریاضتوں کے حسب حال ہے اور ان پر پوری طرح راست آتا ہے ؎

سَهَرِیْ لِتَنْقِیْحِ الْعُلُوْمِ أَلَذُّ لِیْ
مِنْ وَصْلِ غَانِیَةٍ وَطِیْبِ عِنَاقِ

(کسی علمی مسئلہ کی تحقیق اور عقدہ کشائی کے لئے پوری رات جاگنا مجھے دنیا کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہے)

اور پھر زمخشری کی زبان ہی میں حضرت کا یہ پیغام ہم جیسے کوتاہ علم وعمل خردوں کے نام ہے ۔

أَأَبِیْتُ سَهْرَانَ الدُّجٰی وَتَبِیْتُهُ
نَوْمًا وَتَبْغِیْ بَعْدَ ذَاکَ لِحَاقِیْ

(میں رات بھر جاگتا رہوں اور تم رات بھر سوتے رہو، اور پھر تم چاہو کہ تم کو میرا مقام مل جائے، ایسا نہیں ہوسکتا)

حضرت مفتی صاحب نے انضباط اوقات، حفظ اوقات، اصول کی پابندی اور متواتر محنت، شبانہ روز مطالعہ و تحقیق اور علمی اشتغال بلکہ علمی انہماک واعتکاف کی برکات سے عظمت کا مقام بلند حاصل کیا تھا، ان کی سیرت کا یہ گوشہ ان کے اخلاف وتلامذہ کے لئے بہت نصیحت آموز اور فکر انگیز ہے اور یہ سبق دیتا ہے کہ راہِ علم کے مسافروں کو یہ مرحلے سر کئے بغیر منزل نہیں ملا کرتی، اور عمل پیہم اور جہد مسلسل کے بنا رفعت اور سیادت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

دردِ فراق

یوں تو حضرت کے جانے پر پورے کاروانِ علم نے اجتماعی یتیمی کی ٹیس محسوس کی مگر اس حقیر کے لئے قدیم، عقیدتمندانہ اور اٹوٹ تعلق اور رشتۂ محبت کی بنا پر حضرت کا سانحہ وفات بے انتہا صاعقہ اثر ثابت ہوا، جس صبح کو یہ آفتاب علم وفضل غروب ہوا، اس سے پہلے کی رات شدید علالت کی خبروں کی وجہ سے بے قراری اور کروٹ بدلنے اور مسلسل دعا میں گزری، حضرت نے مسافرت اور غریب الدیاری میں وطن سے دور لاک ڈاؤن کے ماحول میں ''مہتاب سے تابندہ تر زندگی'' گزار کر صبح کے تاروں سے بھی خوب تر سفر آخرت شروع کیا، اللہ نے انہیں ایسے وقت اپنے دربار میں بلایا جب رمضان کا مقدس موسم بہار سایہ فگن تھا، عشرۂ اخیر کی رونقیں سب کو شاداب کر رہی تھیں، رحمت کے انوار برس رہے تھے اور کرم نوازیاں عروج پر تھیں، اور ایسے ماحول میں بلایا جب پورا ملک بند تھا، نقل وحرکت پر پابندی تھی، گنتی کے چند لوگ آخری آرام گاہ تک پہونچانے میں شریک ہوسکے، ان کا مزاج ہنگاموں سے نفور رہتا تھا، گویا اس سفر میں بھی منجانب اللہ ان کے اسی مزاج کی رعایت رکھی گئی ہو۔

ہم جیسے نہ جانے کتنے عقیدت مند ان کی رحلت پر غمزدہ اور مزید برآں آخری مرحلے میں شرکت کی سعادت

نہ مل سکنے پر دل مسوس کر رہ گئے، اور آج ایک ماہ سے زائد کی مدت گزر جانے کے بعد بھی قبر پر حاضر ہو کر دعا کی صورت عقیدت کی سوغات پیش کرنے کی راہیں مسدود ہیں، دل چاہتا ہے کہ عقیدت و محبت کے پروں سے پرواز کرتے ہوئے ممبئی کے اس گورستان تک حاضری دوں جسے حضرت کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف میسر آیا اور وہاں پہونچ کر آنسوؤں اور دعاؤں کا نذرانہ پیش کر کے پہلے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

اور پھر شاعر کی زبان میں خاکِ قبر کو مخاطب کر کے یوں گویا ہوں ؎

اے خاکِ تیرہ: دلبرِ ما را نگاہ دار
ایں نورِ چشمِ ماست کہ در بر گرفتہ ای

اور پھر یہ کہتے ہوئے بادیدۂ نم اور بادلِ پُرغم رخصت ہوں ؎

تری لحد پہ خدا کی رحمت
تری لحد کو سلام پہونچے

غَفَرَ اللّٰہُ لَہُ وَأَنْزَلَ عَلَیْہِ شَآبِیْبَ رَحْمَتِہٖ وَأَسْکَنَہُ جَنَّاتِہِ الْعُلیٰ وَنَعِیْمَہُ الْمُقِیْمَ.

❑❑❑

تفردات اور ان کا پیغام

حضرت مفتی صاحبؒ کے تفردات (جنہیں قبول کرنے کا پابند کسی کو نہیں بناتے تھے، بلکہ طلبہ کو معروف اور اجتماعی رائے اور مسلک کا پابند رہنے کی تلقین کرتے تھے، اور یہ ان کے اخلاص کا بین ثبوت بھی تھا) اگرچہ دیگر اہل علم کے ہاں قابل قبول نہ بھی ہوں، ان کے علمی مقام بلند، وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق و تدقیق اور وفورِ علم کے لوازم میں سے ہیں، اور ان تفرادات پر بے جا نقد کرنے اور اپنا عدمِ اتفاق ظاہر کرنے کے بجائے انہیں اس تناظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ علمی سفر میں کتنی صعوبت آزما گھاٹیاں عبور کرنے اور کتنی ریاضتوں کے بعد حضرت کو یہ مقام ملا ہوگا، "تفرداتِ علمی" باعثِ تنقید ہونے کے بجائے باعثِ تحقیق اور دعوتِ مطالعہ و جہدِ مسلسل ہونے چاہئیں۔

حضرت کے معاصرین تو ہم سب کے بڑے ہیں، ان کا مقام بہت اونچا ہے، مگر ہم خردوں کو اپنی سمتِ سفر درست رکھنے کے لئے "علمی تفردات" پر چیں بہ جبیں ہونے اور بے اطمینانی کا اظہار کرنے کے بجائے ان کے بین السطور میں مضمر "محنت اور مسلسل محنت" کے زندہ و تازہ پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔